مؤتمر مستشرقین[1]

از

ڈاکٹر عبدالرؤف ناظم اسلامک سنٹر نیو یارک

ترجمہ: عبدالحمید صدیقی

ستائیسویں بین الاقوامی مؤتمر مستشرقین، اگست ۱۹۶۷ء کی تیرہ تاریخ سے لے کر انیس تاریخ تک شہر آن آربر[2] میں مشی گن یونیورسٹی[3] کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔ تاریخ میں پہلی بار اس اجتماع کے لیے اضلاع متحدہ امریکہ کے ایک شہر کو منتخب کیا گیا ورنہ مستشرقین کی اس عالمی تنظیم کے یوم تاسیس (۱۸۷۳ء بمقام پیرس) سے ایک یورپ ہی میں اسکے اجتماعات منعقد ہوتے رہے ہیں مگر صرف تین اجلاس ہی جو یورپ کے حدود سے باہر منعقد ہوئے۔ ایک ۱۹۰۵ء میں جبکہ یہ الجزائر میں ہوئی، دوسرا ۱۹۶۴ء میں بمقام دہلی اور تیسرا یہ اجتماع جس کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ تقریباً پچاس سے زائد ممالک کے ڈھائی ہزار سے

---

[1] اس مضمون کا بیشتر حصہ عربی کے مشہور مجلہ الوعی الاسلامی کویت (اکتوبر ۱۹۶۷ء) سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ البتہ کچھ مواد جس کی حیثیت توضیح کی سی ہے وہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہے جو نومبر ۶۷ء کے معارف میں شائع ہوا تھا۔

[2] یہ شہر ممالک متحدہ اور کینیڈا کی سرحد پر واقع ہے۔

[3] یہ جامعہ ممالک متحدہ امریکہ کی قدیم اور بڑی جامعات میں سے ہے۔ تقریباً سو سال سے یہاں علوم شرقیہ سے دلچسپی لی جا رہی ہے۔ ذیل کے شعبے اس کے دائرۂ کار کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں (۱) مشرق قریب کی زبانیں اور ادبیات جو عملاً عربی اسلام سے متعلق ہے اور مراکش سے بغداد تک پوری عربی دنیا اس کے دائرے میں آتی ہے۔ (۲) جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے مسائل کا مرکز۔ یہ ایران، افغانستان، برّ اعظم ہند، ملایا اور انڈونیشیا کے ذریعہ بھی اسلام سے اختصاص رکھتا ہے۔ (۳) روس اور مشرقی یورپ کے مسائل کا مرکز، ضمناً جس میں ترکی اسلام بھی زیر بحث آتا ہے۔ ان کے علاوہ قانون، موسیقی، جغرافیہ

اوپر افراد[۱]، جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھیں اس کانفرنس میں شریک ہوئے ۔ دعوت نامے تو اس سے کہیں زیادہ تعداد کو بھیجے گئے تھے ۔ مگر اہلِ علم کی اچھی خاصی تعداد شرکت کے وعدے کے باوجود شریکِ اجتماع نہ ہو سکی اور بالکل آخری وقت میں انہوں نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ ان لوگوں میں روسی[۲] اور چینی علماء بھی شامل ہیں ۔

اس کانفرنس کے انعقاد کا انتظام جمعیت مستشرقین امریکہ اور جمعیت علوم الشیائی نے مشترکہ طور پر کیا۔ امریکہ کی حکومت اور وہاں کی بعض اقتصادی اور معاشرتی انجمنوں نے ان اداروں کی دل کھول کر مالی امداد کی اور انہیں اس قابل بنایا کہ وہ اپنے خرچ پر دنیا کے دور دراز گوشوں سے مندوبین کو بلا سکیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ علم کی معتد بہ تعداد یورپ، مشرقِ بعید اور دوسرے ممالک سے بآسانی شریک ہو سکی۔ جن حضرات کو بھی مدعو کیا گیا تھا اُن سب کو جامعہ کے احاطے میں ٹھیرایا گیا اور اُن کے قیام و طعام کا انتظام کیا گیا ۔

یہ مشی گن یونیورسٹی جس نے اس مرتبہ مندوبین کی مہمان نوازی کا فرض انجام دیا ہے، امریکہ کا ڈیڑھ صدی پُرانا مشہور گہوارۂ علم ہے ۔ یہ جس شہر آر بور میں واقع ہے وہ ایک نہایت خاموش اور پُرسکون جگہ ہے جس میں کثرت سے باغات پائے جاتے ہیں ۔ اس بنا پر یہ مقام علمی مباحث اور غور و فکر کے لیے نہایت موزوں ہے ۔

۲۔ وغیرہ اٹلس (نقشہ ہائے ممالک) حتیٰ کہ نباتیات اور آبی وسائل (مچھلی، پٹرول) وغیرہ کے شعبوں میں بھی مسلمانوں کے وطن سے تفصیلی بحث ہوتی ہے ۔

[۱] اس کانگرس میں جاپانی اور جرمن مستشرقین کی تعداد دوسرے تمام ممالک کے مستشرقین سے زیادہ تھی۔ جاپان سے ایک پورا طیارہ بھر کر آیا تھا۔ فرانس سے نصف درجن مسلمان آئے ۔ پاکستان سے ڈاکٹر قاضی نبی بخش، صدر شعبۂ فارسی جامعۂ سندھ اور ڈاکٹر محمد باقر پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور نے شرکت کی۔ ہندوستان کے کئی ایک فضلا کے نام بھی فہرست میں ملتے ہیں۔ ملیشیا سے آنے والوں کی اچھی خاصی فہرست میں سب کے سب چینی تھے، ایک بھی مسلمان کا نام نظر نہ آتا تھا۔ عرب اسرائیل کی حالیہ جنگ سے قبل اسرائیل میں ڈھائی تین لاکھ مسلمان آباد تھے جن میں بعض نامور اہلِ علم بھی تھے۔ لیکن اُن میں اب کوئی بھی علماء کی صف میں نظر نہیں آتا کہ مؤتمر مستشرقین کے لیے مدعو کیا جا سکے۔ اُن کی کثیر تعداد تو اب اسرائیلی استبداد کی بھینٹ چڑھ گئی ہوگی اور جو چند بچے ہوں گے وہ تحقیق کے بجائے اب خاکروبی اور حمالی میں مصروف ہوں گے ۔

[۲] روس سے جو سرکاری وفد آنے والا تھا اس کے ناموں کی فہرست میں بہت سے اسلامی نام بھی نظر آتے ہیں اور

مستشرقین کی اس عالمی تنظیم نے اس جگہ کا انتخاب کر کے نہایت اچھے ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ پھر یہ انتخاب کرتے وقت ناظمینِ اجتماع کے پیشِ نظر یہ بات بھی تھی کہ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں غیر امریکی مندوبین کو نیویارک اور واشنگٹن کی بآسانی سیر کرائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اس تجویز کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ان مندوبین کے لیے ہر شہر میں تین دن کے قیام کا مفت انتظام کیا اور انہیں وہاں کے قابلِ دید مقامات کی سیر کرائی۔ سب سے زیادہ مسرت ہمیں اس بات کی ہوئی کہ وہاں کے مسلمان طلبہ کی جمعیت نے ہمارے ساتھ پورا پورا تعاون کیا، جمعہ کی نماز ادا کرنے کا نہایت معقول بندوبست کیا اور کانفرنس کے مسلم شرکاء کا ایک خاص اجتماع بھی منعقد کیا۔

"مستشرق" کا لفظ سنتے ہی ہمارے ذہن میں جس انسان کا تصور آتا ہے وہ کوئی پسندیدہ شخص نہیں ہوتا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اُن افراد کے خیالی پیکر گھومنے لگتے ہیں جن کا دنیا میں بجز اس کے اور کوئی کام نہیں کہ وہ اسلام کے خلاف زبانِ طعن دراز کریں اور اس کی مقدس اور پاکیزہ تعلیمات کو ہدفِ ملامت بنائیں۔ ایک مسلمان کا مستشرقین کے بارے میں یہ تصور قائم کرنا بالکل فطری امر ہے، کیونکہ جس تحریک کے یہ لوگ علمبردار ہیں وہ روزِ اوّل ہی سے مغربی استعمار اور مسیحی پادریوں کی اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں کے ساتھ ہم رکاب رہی ہے۔ ان لوگوں نے اسلامی علوم کی تحقیقات کا نام لے کر مسلمانوں کے اندر نفوذ کرنے کی کوشش کی، اور اُن کے فلسفے، اُن کی زبان اور تاریخ اور ادب کی راہ سے اُن پر شبخون مارا اور اُن میں سے جو لوگ اپنے اعتقاد میں راسخ نہ تھے اُن کے ایمان کو متزلزل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مگر اس ضمن میں ہمیں یہ بات نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ لفظ "استشراق" صرف اسلامی تعلیمات ہی کی تحقیق و تجسس کا ہم معنی نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق مشرقی تمدنوں میں سے کسی تمدن سے دلچسپی اور انہماک پر ہوتا ہے۔ اس بنا پر یہ ضروری نہیں کہ مستشرق اسلامی تمدن پر ہی گہری بصیرت رکھتا ہو۔ چینی تمدن، ہندی تمدن، ملایا کا تمدن یا اسی نوعیت کے دوسرے

۲۔ اُن کے القاب میں روسی اکاڈیمی کا رکن ہونا یہ بتاتا ہے کہ بڑے پایہ کے لوگ ہیں۔ البتہ اکثر کے مقالوں میں عصر جدید کا عنصر زیادہ تھا، گویا علم سے کہیں زیادہ سیاست اور ملکی پالیسی کی خدمت پیشِ نظر معلوم ہوئی۔ مگر دوم آخر روس نے حالیہ جنگ عرب و اسرائیل کے باعث مؤتمر کا مقاطعہ کیا اور روس سے کوئی نہیں آیا۔

تمدّن بھی اُس کی دلچسپی کے مرکز و محور ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم اس مؤتمر کے پروگرام پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں "استشراق" کے ذیل میں اسلام کے علاوہ متعدد دوسرے عنوانات بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً: (۱) مشرق قریب کا قدیم تمدن (۲) عالم اسلامی اور مشرقِ قریب (۳) جنوبی ایشیا عہدِ قدیم میں (۴) جنوبی ایشیا عہدِ حاضر میں (۵) جنوب مشرقی ایشیا۔ (۶) چین اور اس کا قدیم تمدّن (۷) عہدِ حاضر میں چینی علوم (۸) جاپانی علوم (۹) وسط ایشیا کے تمدن (۱۰) کوریا کا تمدن۔ ان بڑے بڑے عنوانات کے تحت ہر شعبے کی تفصیلات پر، جن میں تاریخ، علوم و فنون، تعمیرات، لغت، ادب، فلسفہ اور معیشت سب شامل ہیں، متعدد علمی بحثیں کی گئیں۔ پھر ان مختلف ایشیائی ممالک کا جائزہ لیتے وقت اُن کی آبادی، وہاں کے فنونِ لطیفہ، اُن کا دفتری نظام، مغربی تہذیب کا اثر ان ممالک پر، اُن کی موسیقی، ان کے ادبیات میں انقلابی رجحانات، اور مشرقی علوم کے مطالعے کے مختلف ادارے، الغرض وہاں کی اجتماعی زندگی کے سارے گوشوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے علاوہ ہر عنوان پر بحث کرتے ہوئے اس بات کا پُورا پُورا اہتمام کیا گیا کہ اُسے آسانی کے ساتھ جتنی مختلف اکائیوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے کر دیا جائے تاکہ مطالعہ میں گیرائی اور گہرائی پیدا ہو سکے۔ مثلاً مشرق قریب کے قدیم تمدّن کے تحت قدیم مصری تمدّن بابل کا تمدّن، شام کا تمدّن اپنی ساری جزئیات کے ساتھ زیرِ بحث آتے اور اس کے ساتھ ساتھ سامی زبان اور ادب کا بھی ناقدانہ جائزہ لیا گیا۔

آگے بڑھنے سے پیشتر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مستشرق کی تعریف کریں۔ اس سے مراد وہ صاحبِ علم ہے جو کسی مغربی ملک کا رہنے والا ہو اور مشرقی تمدّن کے کسی پہلو کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر اس میں اختصاص حاصل کرے۔ اگر مشرق کا کوئی عالم یہی ذوق رکھتا ہو اور وہ علم کے اسی میدان میں تحقیقی کام کرے تو اُسے مستشرق نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ وہ خود مشرقی ہے اور مشرقی آدمی کا استشراق بے معنی ہے۔ لیکن رسل و رسائل اور حمل و نقل کے جدید ذرائع نے علمائے مشرق اور مغرب کو ایک دوسرے کے قریب آنے کی جو سہولتیں بہم پہنچائی ہیں انہوں نے اختلافات کی خلیج کو بہت حد تک پاٹ دیا ہے۔ اس لیے اب "مستشرق" کے معنی و مفہوم میں بھی خاصی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ اب مشرقی علوم و فنون کا ہر محقق مستشرق کہلانے لگا ہے۔ اگر ہم مستشرق کے لفظ کو جدید مفہوم میں لینے کے بجائے اسے اُس کے سابق مفہوم میں لیں تو

"اسلامی مستشرق" کی اصطلاح اس مغربی محقق اور صاحبِ علم کے لیے استعمال کی جائے گی جو اسلامی تعلیمات اور عربی زبان وادب پر داد تحقیق دے۔

مغربی مستشرقین کی تحقیق اور ان کی بصیرت پر مسلمانوں نے کبھی بھروسہ نہیں کیا ہے بلکہ اُن کے علمی کارناموں کو ہمیشہ شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا ہے، مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کی تحقیقات نے مسلمانوں کی علمی میراث سے جدید انسان کو روشناس کرایا ہے، اور اُن کی محنت اور عرقریزی کی بدولت تمدّنِ اسلامی اور عربی زبان اور ادب کے کئی مستور گوشے دنیا کے سامنے بے نقاب ہوتے ہیں۔ مغرب میں اہلِ علم کو تحقیق وتجسّس کی جو غیر معمولی سہولتیں حاصل ہیں ان سے استفادہ کرتے ہوئے ان لوگوں نے تحقیقات کے میدان میں بعض قابلِ رشک کارنامے انجام دیئے۔ انہوں نے مسلمانوں کے نامور اسلاف کے چھپے ہوئے علمی خزائن کا کھوج لگا کر ان کو عام اہلِ علم کی دسترس تک پہنچایا۔ اُن کو جدید علمی تقاضوں کے مطابق از سرِ نَو مرتب کیا۔ ان کی تبویب کی۔ ان کے اشاریے تیار کیے اور بہترین طباعت کے ساتھ ان کو شائع کیا۔ اس طرح آنے والے اہلِ علم کے لیے مزید تحقیق کی آسانیاں پیدا کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن حضرات نے اس نئے مرتب کردہ مواد کو سامنے رکھ کر تحقیق کا کام کیا ہے انہوں نے اپنی اس کاوش کے بہتر نتائج حاصل کیے ہیں اور ہماری تاریخ اور تمدن کے ایسے ایسے گوشوں تک رسائی حاصل کی ہے جن تک پہلے محققین کی نگاہیں نہ پہنچی تھیں۔ البتہ ان کی علمی کوششوں کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اکثر وبیشتر مستشرقین نے اسلامی علوم اور ادب کی یہ خدمت اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کسی مخلصانہ تعلق کی بنا پر نہیں کی ہے۔ ان کے پیشِ نظر یا تو اپنی اپنی قوموں کی سیاسی اغراض تھیں جن کی خاطر وہ مسلمانوں کی رگ رگ سے واقفیت حاصل کر کے ان کو مغربی استعمار کے جال میں پھانسنا چاہتے تھے۔ یا مذہبی اغراض تھیں جن کے لیے یہودی اور مسیحی علماء اسلام کو اعتراضات کا ہدف بنانا اور مسلمانوں کو گمراہ کرنا اور دنیا کو اسلام سے متنفر کرنا چاہتے تھے۔ ان اغراض کے لیے انہوں نے اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کا ناقدانہ جائزہ لینا شروع کیا اور بالکل اتفاقی طور پر ان کے ہاتھوں اسلامی علوم وفنون کے بعض تابناک اور منوّر گوشے بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے آ گئے۔ یہ سب کچھ اُن کی کسی اچھی تدبیر اور مقدس عزم کے نتیجے میں واقع نہیں ہوا بلکہ جو کچھ انہوں نے شر کے ارادے سے کیا اس

میں سے خیر کا پہلو نکل آیا۔ ان کے برعکس دورِ حاضر میں ہمارے بہت سے مسلمان اہلِ علم نے ان مستشرقین کے دوش بدوش کھڑے ہو کر علم و تحقیق کے میدان میں ایسے نمایاں کارنامے سرانجام دیئے ہیں جو نئی معلومات، علمی گہرائی، اسلوبِ بیان اور استنباطِ نتائج کے اعتبار سے مستشرقین کی کاوشوں سے کہیں زیادہ وقیع اور قابلِ اعتماد ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان محققین نے ان مغربی اہلِ علم کی طرح کچھ گھٹیا مقاصد سامنے رکھ کر تحقیق کی کوششیں نہ کیں، بلکہ علمی کاوش کو ایک مقدس کام سمجھ کر اُسے بغیر کسی تعصب اور تنگ نظری کے سرانجام دیا۔ اُن کے پیشِ نظر سوائے تلاشِ حق کے اور مقصد نہ تھا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ مستشرقین اپنے مسلمان شاگردوں میں ایک معتدبہ گروہ کو گمراہ کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔

جب مؤتمر کے انعقاد کے لیے کسی مقام کا انتخاب کر لیا جاتا ہے تو اس کے انتظامات کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جاتی ہے جس کے صدر اور سکرٹری بالعموم اس مقام کے نامور مستشرقین ہوتے ہیں تاکہ وہ اجتماع کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے لیے مناسب جدوجہد کر سکیں۔ اسی قاعدے کے مطابق تازہ کانفرنس کے لیے پروفیسر نارمن براؤن کو مجلسِ منتظمہ کا صدر اور پروفیسر رسل وینفیلڈ کو سکرٹری مقرر کیا گیا۔ اول الذکر ہندوستانی علوم کے نامور محقق تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ثانی الذکر مشی گن یونیورسٹی کے مشہور استاد ہیں اور جنوب مشرقی ایشیا کے تہذیب و تمدن پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس مؤتمر کے انتظام و انصرام کے لیے بعض دوسری کمیٹیوں کی بھی تشکیل کی گئی جن میں مجلسِ مشاورت غیر معمولی اہمیت کی حامل تھی۔ اس کے ایک بالغ نظر رکن جناب پروفیسر محمد خلف اللہ احمد تھے جو ایک مشہور ادیب اور عالم ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف علوم و فنون کے شعبوں کی الگ الگ کمیٹیاں بھی تھیں اور اسلامی شعبے کے صدر کیلیفورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر گرونبام تھے جنہوں نے اسلامی موضوعات پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں سے ایک اسلامی تیوہاروں پر ہے، دوسری "اسلام قرونِ وسطیٰ میں" اور تیسری "اسلام عہدِ حاضر میں"۔

کانفرنس کی افتتاحی تقریب مشی گن یونیورسٹی کے ہال میں منعقد ہوئی۔ اس میں رئیس الجامعہ نے مندوبین کا خیر مقدم کیا۔ اس تقریب کا سب سے اہم حصہ پروفیسر ہمایوں کبیر، گذشتہ مؤتمر کے صدر کی فکر انگیز تقریر تھی۔ انہوں نے بتایا کہ انسانوں کے مختلف طبقات کے درمیان فکر و عمل کے اختلافات کے

باوجود کس طرح تعاون کی راہیں نکالی جاسکتی ہیں۔ پھر انہوں نے دورِ جدید میں قوموں اور گروہوں کے درمیان حرب و نزاع کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے بتایا کہ اس عالمگیر فساد کا ایک بڑا سبب وہ خوف اور ہراس ہے جو اقلیت کو اکثریت کے مقابلے میں ہمیشہ لاحق رہتا ہے، اور اکثریت کی وہ ہوس ہے جس کی بناپر وہ اقلیت کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتی ہے۔ پروفیسر صاحب نے انسانیت کے درمیان اختلافات کے فطری عوامل، مثلاً رنگ، نسل، زبان، مذہب اور سیاسی و معاشی نظریات کی بھی نشاندہی کی، پھر ان عوامل میں سے ہر ایک کا الگ الگ تجزیہ کرکے یہ ثابت کیا کہ ان اسبابِ اختلاف کے مقابلے میں اخوتِ انسانی کے رشتے کہیں زیادہ مضبوط اور قوی ہیں۔ انہوں نے اپنے اس دعوے کی تائید تاریخِ اسلامی سے کی اور بتایا کہ اسلام نے کس طرح مختلف قوموں اور نسلوں کے افراد کو جو رنگ، زبان اور روایات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھے، جمع کرکے انہیں ایک ایسی وسیع برادری کے ارکان بنادیا جس میں یہ سارے اختلافات بالکل بے وزن ہو کر رہ گئے اور انسان کو امن اور سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔

اس افتتاحی خطاب کے بعد موضوعات کی مناسبت سے مختلف حلقے بنادیئے گئے جن کے اجتماعات مختلف مقامات[1] پر منعقد ہوتے تھے۔ شام کا وقت استقبال اور اسی نوعیت کی دوسری تقریبات کے لیے وقف ہوتا تھا۔ ایک دن ہمیں جنوبی عرب کے اُن آثارِ قدیمہ کا فلم دکھایا گیا جو ابھی ابھی دریافت ہوئے ہیں۔ ان سے قدیم تاریخ و تمدن کے متعلق بہت سی نئی معلومات حاصل ہوئیں۔ یہ حلقے پورا ہفتہ اسی باقاعدگی کے ساتھ سرگرمِ عمل رہے یہاں تک کہ ۱۹ اگست کو مؤتمر کا آخری اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں میزبانوں اور مؤتمر کے کارپردازوں کا شکریہ ادا کیا گیا۔

---

[1] ان حلقوں کی تشکیل میں بھی بعض سیاسی مصالح کارفرما رہے۔ مثلاً ترکی کے مسائل کو عالمِ اسلامی کے مسائل سے الگ کرکے موضوعِ بحث بنایا گیا حتیٰ کہ اُن کے اجلاس بھی الگ الگ عمارتوں میں رکھے گئے جن میں باہم میل بھر کا فاصلہ تھا۔ اس طرح گویا ترکوں کو اسلامی برادری سے جُدا کر دیا گیا۔ جنوب ایشیا قدیم زمانے کا جائزہ ہندوستان کو الگ کرکے، اور جنوب ایشیا جدید زمانے کا تجزیہ انڈونیشیا اور ملایا کو الگ کرکے کیا گیا۔ اس کے پیچھے یہ مقصد کارفرما تھا کہ اسلام کی اہمیت کو جس قدر گھٹایا جاسکے گھٹایا جائے۔

اسلام اس مؤتمر کی دلچسپی کا سب سے زیادہ اہم موضوع تھا۔ اس موضوع پر بحث کے لیے سب سے زیادہ حلقے قائم کیے گئے اور سب سے زیادہ مقالات پڑھے گئے۔ چند اہم موضوعات یہ تھے: مشرق قریب دورِ جدید میں۔ فارسی ادب۔ عربی زبان۔ عربی ادب۔ مشرق قریب کی تاریخ۔ تاریخ اسلامی۔ اسلامی اقدار۔ دولتِ عثمانیہ کے عہد میں اسلامی مملکت کا نظم ونسق۔ مشرق قریب میں فن تعمیرات۔ فقہ اسلامی۔ مسئلۂ آبادی اور معاشی پیچیدگیاں عثمانی عہد میں ترکی ادب۔ روس اور ترک۔ دین اسلام۔ مشرق قریب انیسویں اور بیسویں صدی میں۔ دولتِ عثمانیہ کی تاریخ۔ تجارت۔ اسلامی علوم۔ ترکی انیسویں اور بیسویں صدی میں۔ تاریخ اسلامی کی مشہور کتابیں۔

ان موضوعات پر بحث کے لیے ہر حلقہ کے متعدد اجتماعات ہوتے، اور ہر موضوع کی مناسبت سے جتنے دوسرے موضوعات زیر بحث آسکتے تھے اُن پر بھی کھُل کر بحث کی گئی۔ مثلاً مسلمان ممالک کا نظامِ تعلیم و تربیت۔ معاشی اور سیاسی حالات۔ نظریاتی اور دینی رجحانات۔ اسلام کا نظامِ معاشرت اور اس کی اخلاقی اقدار۔ عربی ادب۔ مسلمانوں کے مختلف فرقے اور اُن کے درمیان اختلافات کی نوعیت۔ حقیقتِ وحی اور اس کا نظامِ شریعت سے تعلق۔ تصوّف۔ موسیقی۔ عربی زبان کے مختلف لہجے اور فصیح اور عامی زبان میں امتیازات۔ تاریخی موضوعات پر گفتگو میں تو ضمناً مسلمانوں کے ماضی اور حال کی نامور شخصیتیں بھی زیر بحث آجاتیں۔ ان متعدد حلقوں کے قیام کا فائدہ یہ تھا کہ ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق جس حلقے میں چاہتا شریک ہو جاتا۔

مؤتمر میں اظہارِ خیال کا ذریعہ انگریزی زبان تھی۔ البتہ بعض مقالات جرمنی اور فرانسیسی میں پڑھے گئے اور ایک دو اہلِ علم نے اپنے خیالات عربی زبان میں پیش کیے۔

ایک خاص مجلس امریکہ میں معلمین عربی کے زیرِ اہتمام عربی زبان کی تدریس اور اس راہ کی مشکلات کا جائزہ لینے کے لیے منعقد کی گئی۔ کافی غور و خوض کے بعد مندوبین اس نتیجے پر پہنچے کہ عربی کی تعلیم کا آغاز بنیادی مفرد الفاظ کے تعارف سے کیا جائے اور عربی زبان کی صرف و نحو پڑھانے کے لیے عربی اصطلاحات ہی استعمال کی جائیں، اور ان اصطلاحات کے ہم معنی دوسری زبانوں کی گرامر کے مصطلحات حتی الامکان استعمال نہ کیے جائیں۔ اسی سلسلے میں جدید عربی زبان کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ امریکہ میں یہ رُجحان اب عام ہو رہا ہے کہ قدیم فصیح عربی کی جگہ عامی زبان کو رواج دیا جائے۔ ان مفکرین نے عامی زبان کی جگہ "مستعمل زبان" کی اصطلاح رائج کر رکھی ہے۔ ان کا خیال

یہ ہے کہ مصر، تیونس اور مراکش کے عوام میں عربی زبان کی جو علاقائی صورتیں مستعمل ہیں انہیں ہی معیاری اور فصیح زبان تسلیم کر کے اُن کی تدریس پر زور دیا جائے۔ مقامِ شکر ہے کہ اس تحریک کے پیچھے جو ناپاک عزائم کام کر رہے ہیں انہیں عرب اُدَبا نے اچھی طرح بھانپ لیا ہے اور وہ اس خطرناک رجحان کو پُوری قوت سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ علاقائی اور مقامی زبان پر زور دینے کی غرض بجز اس کے کوئی نہیں کہ عربوں کی وحدت کو پارہ پارہ کیا جائے کیونکہ ان کے درمیان صرف قرآنی عربی ہی مشترک ہے نہ کہ مختلف علاقوں کی عامی زبانیں۔

اس مؤتمر کا انعقاد تنہا مستشرقین کی کاوشوں کا ثمرہ نہیں ہے۔ بہت سے عرب علماء نے جو امریکہ کی مختلف جامعات میں اس وقت نہایت اونچے مناصب پر فائز ہیں، انہوں نے اس کی کامیابی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ عرب فضلا کی مؤتمر سے دلچسپی کوئی نئی بات نہیں۔ جس دن سے اس کی تاسیس ہوئی ہے وہ مستشرقین کی اس عالمی تنظیم کے ساتھ پُورا پُورا تعاون کر رہے ہیں۔ یہاں اتنا موقع نہیں کہ ان کے علمی کارناموں کی تفصیل بیان کی جائے۔ اس کام کو میں کسی اور موقع پر اٹھا رکھتا ہوں۔ یہاں مَیں صرف دو مقالات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

عربی زبان اور ادب کے نامور عالم جناب حفنی ناصف مرحوم نے ساتویں مؤتمر میں جو ۱۸۸۶ء میں بمقام دانیا منعقد ہوئی تھی، عربی زبان اور ادب پر ایک نہایت ہی معلومات افزا مقالہ (بعنوان "عربی زبان کی امتیازی خصوصیات، اس کے مقامی لہجے اور تاریخ میں ان کی افادیت") پڑھا تھا۔ اس میں انہوں نے یہ بتایا تھا کہ اس زبان میں ہمیں لہجوں کا جو اختلاف ملتا ہے اس کی مدد سے ہم عرب کے قریشی اور غیر قریشی قبائل کے درمیان امتیاز کر سکتے ہیں۔ مثلاً صعید مصر میں اہل منیا اور بنی سویف کے لوگوں کے درمیان حرف قاف کے تلفظ میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس سے اُن کے آبا و اجداد کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ خالص قاف بولتا ہے اور دوسرا اسے کاف بنا دیتا ہے۔ یہی فرق قریش اور دوسرے عربی قبائل کے تلفظ میں پایا جاتا تھا۔ قریش خالص قاف بولتے تھے اور دوسرے قبائل اس کا تلفظ کاف کے قریب قریب کرتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنی سویف کے عرب قریش کی اولاد ہیں۔ اسی طرح اہل فیوم اور اہل بلبیس کے تلفظِ قاف سے ان کے قریشی ہونے اور شرقی علاقوں اور صعید مصر کے دوسرے علاقوں کے تلفظ قاف سے ان کے غیر قریشی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

۱۸۸۹ء میں جو موتمر بمقام سٹاک ہام (سویڈن) منعقد ہوئی تھی اس میں مصری وفد کے ایک فاضل رکن امین فکری مرحوم نے اُن لوگوں کے خیالات کی تردید میں نہایت فکر انگیز مقالہ پڑھا تھا جو فصیح عربی کی جگہ مقامی عربی کو رواج دینے اور اسے ذریعۂ تالیف و تدریس بنانے کے حق میں تھے۔ انہوں نے پورے دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا تھا کہ مقامی بولی کبھی بھی اصل اور فصیح زبان کا بدل نہیں بن سکتی اور نہ یہ تالیف و تدریس کا مؤثر اور قابلِ اعتماد ذریعہ ہو سکتی ہے۔ اصل عربی عرب قوموں کے دل و دماغ میں راسخ ہے اور یہ اُن کے افراد کے مابین ایک نہایت مضبوط رابطہ قائم کرتی ہے۔ عامی زبان ہر مقام پر بدلتی رہتی ہے اور دوسرے مقامات کے لوگوں کو اس کے سمجھنے میں بہت سی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے اپنے اس مضبوط موقف کی وضاحت متعدد مثالوں سے کی۔ مثلاً انہوں نے بتایا کہ کیف حالك (آپ کا کیا حال ہے) فصیح عربی کا جملہ ہونے کی وجہ سے تمام دنیا کے عربوں میں بآسانی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم اس جملہ کی جگہ مقامی الفاظ بولیں تو ایک خطے سے باہر اُسے سمجھنے میں غیر معمولی دشواری پیش آئے گی۔ فصیح عربی زبان کا لفظ اور محاورہ اور تلفظ مقام کے ساتھ کبھی تبدیل نہیں ہوتا اور وہ ہر جگہ ایک ہی جیسا رہتا ہے۔ اس بنا پر جو کچھ اس زبان میں لکھا جائے گا اسے ساری دنیا کے عربی داں یکساں سہولت کے ساتھ پڑھیں اور سمجھیں گے۔ لیکن مقامی بولیوں کا لٹریچر ایک ایک علاقے کے لیے مخصوص ہو کر رہ جائے گا۔ یہ خیال کہ عامی زبان کو علوم و فنون کی تدوین اور تدریس کا بہتر ذریعہ بنایا جا سکتا ہے بالکل غلط ہے۔ فصیح عربی اس مقصد کے لیے کہیں زیادہ موزوں اور مفید ہے۔